بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

پاکستان اگرچہ بڑی نیک تمناؤں اور پاکیزہ ارادوں کے ساتھ معرضِ وجود میں آیا مگر افسوس جب یہ سہانا خواب شرمندۂ تعبیر ہُوا تو عالمِ واقعات میں جو کچھ ہُوا وہ ان مقدس آرزوؤں کا خون تھا جنہیں پاک و ہند کے مسلمان برسہا برس سے سینوں میں پال رہے تھے اور جن کی تکمیل کے لیے انہوں نے پاکستان کی تشکیل کے وقت آگ اور خون کے سمندر میں سے گزرنا گوارا کیا۔ اس حزنیہ کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ مُسلم قوم کے جذبات کو پاکستان بننے کے بعد جتنے چرکے لگے ہیں اور انہیں جن مصائب سے پیہم دوچار ہونا پڑا ہے اُن کا پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے کبھی تصوّر بھی نہ کیا جا سکتا تھا۔ پاکستانی مسلمانوں کی محرومیوں اور صدمات کی فہرست طویل ہے لیکن شاید اُن میں سرِفہرست دستور سازی کا المیہ ہے۔ اُس ملک کی اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ جو قومیت کے کسی مادّی تصوّر کی اساس پر معرضِ وجود میں آنے کے بجائے ایک خاص دینی اور اخلاقی مقصد کے حصُول اور ایک خاص روحانی نظریۂ حیات کے عملی تقاضوں کو بروئے کار لانے کے لیے معرضِ وجود میں آئے مگر قائم ہوتے ہی اس مقصد اور نظریۂ حیات کو نظروں سے اوجھل کر دے اور اس کے باشندے پورے ۲۵ سال تک اندھیروں میں بھٹک کر اپنی قوتیں ضائع کرتے رہیں۔

وہ قومیں جن کا مقصد محض حصُولِ آزادی ہوتا ہے ان کے لیے آزادی حاصل کر لینے کے بعد یہ سوال واقعی بڑی پریشانی کا باعث بنتا ہے کہ اُن کی جدوجہد کی کیا سمت ہو لیکن وہ قومیں جو آزادی کو مقصود بالذات سمجھ کر اس کے لیے کوشاں نہیں ہوتیں بلکہ اُسے کسی دوسرے ارفع و اعلیٰ مقصد کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے ہوئے اس کے لیے تگ و دو کرتی ہیں ان کے لیے سمت کا تعین قطعاً کوئی مسئلہ نہیں

ہوتا کیونکہ اُن کی سمت تو پہلے سے متعین ہوتی ہے اور وہ آزادی کی بھی اس لیے طالب ہوتی ہے کہ غلامی زائل کئے بغیر صحیح سمت پر بڑھنے کی راہ میں جو موانع کھڑے کر رکھے ہیں اُنہیں دُور کر کے وہ سرعت کے ساتھ منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکیں۔ اس طرح کی بامقصد اور مخصوص نظریات کی علمبردار قومیں اجتماعی جدوجہد کے رُخ متعین کرنے میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتیں بلکہ اپنی صلاحیتیں مقصد کے حصُول اور نظریۂ حیات کی سربلندی میں کھپاتی ہیں۔ ہم اسے عہدِ حاضر کا ایک عظیم المیہ سمجھتے ہیں کہ پاکستان کی مقدس سرزمین ربع صدی گزرنے کے بعد بھی عملاً ایک خطۂ بے آئین ہے اور اس کے باشندے جو پاکستان بننے سے پہلے ایک مقصد کے حصول کی خاطر باہم متحد تھے۔ اب کربناک انتشار کا شکار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ قوم کے اندر جو یہ خوفناک قسم کی پریشان فکری پیدا ہوتی ہے اس کی ذمّہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ اس کا نہایت واضح اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ اس کا ذمّہ دار وہ محدُود سا طبقہ ہے جو فکر و احساس کے اعتبار سے پاکستانی سے کہیں زیادہ مغربی ہے مگر جسے انگریز تقسیمِ ملک کے وقت اقتدار کی باگیں سونپ کر رخصت ہُوا۔ اس "مؤثر اور با اختیار اقلیت" کی سازشوں سے ملک ابھی تک اسلامی دستور کی برکات سے محروم رہا ہے اور جو کام پاکستان بننے کے فوراً بعد بغیر کسی تاخیر کے پایۂ تکمیل تک پہنچ جانا چاہیے تھا وہ آج تک کھٹائی میں پڑا ہوا ہے۔ یہ بات کسی حد تک اطمینان کی موجب ہے کہ پاکستان کی دستوری بنیادوں پر مختلف سیاسی جماعتوں کے مابین ایک سمجھوتہ ہو گیا ہے اور اس سمجھوتے سے یہ آس لگی ہے کہ اس مقدس سرزمین پر کسی اچھے دستور کی عملداری ہو گی اور اس طرح عوام اور حکمران ایک ضابطہ کے مطابق اپنے حقوق کا تحفظ اور اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں گے ہم نے اس سمجھوتے کو "کسی حد تک اطمینان بخش" اس لیے کہا ہے کہ گذشتہ سالوں میں دستور سازی کا جو حشر ہوتا رہا ہے اُسے دیکھتے ہوئے ذہنوں میں کئی ایک خدشات پیدا ہوتے ہیں۔ خدا کرے کہ یہ خدشات غلط ثابت ہوں اور ملک ایک صحیح اسلامی دستور کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔

ان صفحات میں ہم ان چند خدشات کی نشاندہی کرنا چاہتے ہیں :

ہمارا پہلا خدشہ نوعیت کے اعتبار سے اُس بدنصیب عورت کے احساسِ محرومی سے ملتا ہے جسے

ہم بچپن میں گھر کی بوڑھی عورتوں سے سوئیوں کی کہانی میں سنا کرتے تھے، یعنی ایک شہزادی کو اس کے باپ نے کسی وجہ سے ناراض ہو کر گھر سے نکال دیا اور اتفاقاتِ زمانہ سے وہ ایک ایسے شہزادے کے پاس جا پہنچی جس کے سارے بدن میں سوئیاں چبھی ہوئی تھیں اور نیم جان پڑا تھا۔ یہ بدنصیب شہزادی بڑی محنت اور دلسوزی کے ساتھ اس کے بدن سے سوئیاں نکالتی رہی مگر جب آخری سوئی نکالنے کا وقت آیا جس کے نکلتے ہی شہزادے کو ہوش میں آنا تھا تو عین اس وقت ایک ایسی عورت درمیان میں آ ٹپکی جس کے منحوس ہاتھ لگتے ہی شہزادے کے سارے جسم میں ازسرِنو سوئیاں پیوست ہو گئیں۔ قسمت کی ماری شہزادی پھر انہیں نکالنے میں مصروف ہو گئی، مگر ہر بار جب ایک سوئی باقی رہ جاتی تو پھر کوئی اسی قسم کا حادثہ پیش آ جاتا جس سے شہزادے کے جسم میں پھر سے سوئیاں چبھ جاتیں اور اس طرح اس بدنصیب شہزادی کی محنت مسلسل رائگاں جاتی رہی۔

ہمارے اس ملک میں تدوینِ دستور کی داستان بھی اسی طرح حسرتناک ہے جس طرح شہزادی کی محنت کا زیاں اور شہزادے کا تکلیف اور دکھ سے نجات حاصل کرتے کرتے پھر سے اُس میں مبتلا ہو جانا۔ اگر عوام کو بدنصیب شہزادی کے مقام پر رکھ کر اور دستوری مسئلے کو شہزادے پر قیاس کر کے غور کیا جائے تو یہ داستان اسی طرح دلفگار معلوم ہوتی ہے جس طرح ہم سوئیوں کی کہانی میں دیکھتے ہیں۔ دستور کا مسئلہ ہمارے لیے کوئی خاص مسئلہ نہ تھا۔ اس کے بارے میں قوم نہایت صحت مندانہ رجحانات رکھتی ہے اور نہ صرف دستوری بنیادوں کے معاملے میں بلکہ ضروری جزئیات کے بارے میں بھی پوری طرح متفق و متحد تھی مگر بے دین طبقے نے نوکر شاہی سے سازباز کر کے ایک طرف تو عوام کو بےبس بنا کر رکھ دیا اور دوسری طرف اسلام کی اساس پر تیار ہونے والے دستوری ڈھانچے میں شکوک و شبہات کی زہریلی سوئیاں چبھو کر اسے بے جان بنانے کی کوشش کی۔ اسلام کے شیدائی اور ملک کے بہی خواہ بڑی محنت کے ساتھ شکوک و شبہات کی ان سوئیوں کو نکالتے اور اُسے ایک غالب قوت بنانے کے لیے پوری قوم کو تیار کرتے، مگر چند منحوس ہاتھ آگے بڑھ کر اس کا راستہ روکتے اور اس کے بدن میں سوئیاں چبھو کر اُسے نیم جان بسمل کی طرح دُور پھینک دیتے۔ اہلِ پاکستان کے گذشتہ پچیس برس محنت کے پیہم زیاں اور بار بار کی محرومیوں کے صدمات سہتے گزرے ہیں۔ وہ دستور کے معاملے میں ساحلِ مراد پہ پہنچنے والے ہی ہوتے ہیں کہ کوئی بپھری ہوئی موج یکایک نمودار ہوتی ہے اور ان کے اور

ساحل کے درمیان طویل فاصلے حائل کر دیتی ہے۔

جس وقت پاکستان معرضِ وجود میں آیا اُسی وقت پاکستانی عوام نے اسلامی دستور کے نفاذ کا مطالبہ شروع کیا یعنی جو کام خود برسرِ اقتدار طبقے کو آگے بڑھ کر فوراً کرنا چاہیے تھا اس کے لیے عوام کو تقاضا کرنا پڑا۔ اصحابِ اقتدار کی اس روش سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ اسلامی دستور سے فرار کی راہیں تلاش کر رہے ہیں اور اسے ایک ناقابلِ برداشت بوجھ سمجھ کر اس کے اٹھانے میں سخت متامل ہیں چنانچہ اسلامی دستور کے خلاف پراپیگنڈے کی باقاعدہ مہم شروع کی گئی اور اسے ایک فرسودہ اور ناقابلِ عمل دستور ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا گیا۔ جو افراد یا طبقے کسی پہلو سے بھی اسلامی دستور کے نفاذ میں مزاحم ہو سکتے تھے یا اس کے خلاف عوام کے ذہنوں میں کوئی بدگمانیاں پیدا کر سکتے تھے حکومت نے ان کی پوری پوری سرپرستی کی مگر اللہ نے اس طبقے کی ساری کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اسلام کے فدائیوں نے نہایت واضح اور ٹھوس دلائل سے اس حقیقت کو ثابت کیا کہ اسلامی نظام کے اپنانے میں نہ صرف پاکستان بلکہ پوری انسانیت کی بھلائی کا راز مضمر ہے۔ اسلامی دستور وقت کے تقاضوں کو بطریقِ احسن پورا کر سکتا ہے۔ دنیا کا کوئی دوسرا دستور ایسا نہیں جو نوعِ بشری کے سارے دکھوں کا مداوا کر کے اسے صحیح معنوں میں فلاح و کامرانی سے ہمکنار کر سکے۔ دینِ حق کے علمبرداروں نے ایک طرف تو اسلامی نظام کے بارے میں اہلِ مغرب اور اپنے ملک کے بے دین طبقوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دُور کیا اور اس نظام کی برکات سے عوام کو اچھی طرح روشناس کرایا اور دوسری طرف اس معاملے میں انہیں اُن کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا کہ اہلِ پاکستان کا اسلامی نظام سے انحراف خدا اور خلق دونوں سے غداری ہے۔ کیونکہ انہوں نے پاکستان کا مطالبہ ہی اس سرزمین کو اسلام کی تجربہ گاہ بنانے کے لیے کیا تھا۔ اس لیے اب اگر وہ اسلام کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام اس ملک میں نافذ کرتے ہیں تو درحقیقت وہ خالقِ کائنات اور اس کی مخلوق کو دھوکا دیتے ہیں۔ اہلِ ایمان کی کوششوں کو اللہ تعالیٰ نے بارآور کیا اور مطالبۂ نظامِ اسلامی نے اس حد تک زور پکڑا کہ حکمران طبقوں کو قراردادِ مقاصد کی صورت میں اس بات کو تسلیم کرنا پڑا کہ پاکستان کے دستور کی اساس اسلامی ہوگی۔ اس کے بعد بھی یہاں کے بے دین طبقے اسلام سے انحراف کی راہیں ڈھونڈتے رہے اور دستور سازی کے کام کو مختلف حیلے بہانوں سے

ٹالتے رہے مگر عوام نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ بالآخر ۱۹۵۴ء کا دستور سامنے آیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۶ء میں ایک ایسا دستور مدون ہوا جو نہ صرف اساس بلکہ مزاج کے اعتبار سے بھی اسلامی تھا اور جو تھوڑے سے تغیر و تبدل کے ساتھ اگر سو فیصد نہیں تو بڑی حد تک اسلامی دستور کہلانے کا مستحق تھا۔ قوم نے بھی اس دستور کو قبول کرنے میں پوری آمادگی ظاہر کی مگر عین اس وقت جب اس دستور کے نفاذ کے بعد اس کی بنیاد پر ملک میں نئے انتخابات ہونے والے تھے تو فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے فوج کی مدد سے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور اس طرح قوم کی گیارہ سالہ جدوجہد کے نتائج کو برباد کر کے رکھ دیا۔ فوج کے کمانڈر انچیف پورے چار برس تک تو مارشل لا کے مطابق حکومت کرتے رہے اور ۱۹۶۲ء میں قوم کے منشا اور مرضی کے علی الرغم اس پر ایک ایسا دستور مسلط کر دیا جو ہر لحاظ سے آمریت کا آئینہ دار تھا اور جس کی تدوین کی غرض و غایت بجز اس کے اور کوئی نہ تھی کہ ملک میں آمریت کو دوام بخشا جائے اور سربراہِ مملکت کی ساری کارروائیوں کو دستور کی رُو سے سندِ جواز حاصل ہو سکے۔

قوم کو ایک غیر اسلامی اور غیر جمہوری دستور کے خلاف از سرِ نو جدوجہد کرنا پڑی اور بڑی دقت کے ساتھ فیلڈ مارشل صاحب مروجہ دستور میں مناسب تبدیلیاں کرنے پر رضامند ہوئے۔ اس غرض کے لیے انہوں نے مختلف سیاسی جماعتوں کے زعماء کی گول میز کانفرنس بھی طلب کی اور قوم کے ان دو بڑے مطالبات یعنی براہِ راست انتخابات اور وفاقی پارلیمانی نظامِ حکومت کے قیام کو تسلیم کر لیا۔ ان دو چیزوں کو تسلیم کر لینے کے بعد ۱۹۶۲ء اور ۱۹۵۶ء کے دستور میں برائے نام فرق رہ جاتا تھا اور قوم ایک صحیح سمت پر گامزن ہونے کے قابل ہو سکتی تھی لیکن اس فیصلہ کن اور نازک مرحلے پر پھر ایک کف بدہن موج اٹھی اور قوم کو اٹھا کر مارشل لا کی تاریکیوں میں پھینک آئی۔

یحییٰ صاحب کو اگر پاکستان کا مستقبل عزیز ہوتا تو وہ نئے دستور کے بکھیڑوں میں پڑنے کے بجائے ۱۹۵۶ء کا دستور نافذ کر دیتے جسے فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب نے مارشل لا کے ذریعے منسوخ کر دیا تھا۔ اُن کے لیے صحیح اور معقول راستہ بھی یہی تھا کہ جس مقام سے جمہوریت کی گاڑی پٹری سے اُتری تھی اُسے اسی مقام سے پٹری پر ڈال دیتے مگر انہوں نے نہایت سنگین حالات میں ایسے کام اپنے ذمے لے لیے

جنہیں سرانجام دینے کی نہ تو ان میں اہلیت تھی اور نہ حوصلہ اور تدبر۔ جس وقت انہوں نے مسندِ اقتدار سنبھالی اس وقت ملک میں اتحاد کی فضا کافی حد تک مکدر ہو چکی تھی اور پوری قوم شدید ذہنی خلفشار کا شکار تھی۔

فیلڈ مارشل محمد ایوب صاحب کے غلط طرزِ فکر اور آمرانہ طرزِ عمل نے باطل قوتوں کو کھل کھیلنے کے پورے مواقع فراہم کر رکھے تھے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آمریت کا تحفظ حاصل کر کے باطل نے آزادی کے ساتھ نشوونما پائی اور زندگی کے ہر شعبے میں اپنا تسلط اور بالاتری قائم کرنے کی کوشش کی۔ یحییٰ خان کے دور میں ان قوتوں کو اپنی مذموم کارروائیاں جاری رکھنے کی اور بھی آزادی حاصل ہوتی۔ چنانچہ انہوں نے عوام کے جذبات میں اس قدر ہیجان پیدا کیا کہ اُن کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بالکل مفلوج ہو کر رہ گئیں۔ اس انتہائی ہیجان انگیز فضا میں جب عوام کی قوتِ فیصلہ بالکل معطل ہو کر رہ گئی تھی، انتخابات کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا اور نئی دستور ساز اسمبلی کے بقا کا سارا دارومدار اس بات پر رکھا گیا کہ وہ ۱۲۰ دن کے اندر تدوینِ دستور کے کام کو مکمل کرے۔ افراتفری کے عالم میں بھڑکے ہوئے جذبات کے ساتھ جب عوام کو اپنے نمائندے چننے کا اختیار دیا گیا تو انہوں نے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جو زبان کے استعمال کے معاملے میں دوسروں کی نسبت زیادہ مطلق العنان تھے۔ جو عوام کے جذبات سے کھیلنے میں زیادہ مشاق تھے اور جھوٹے وعدوں اور جھوٹی امیدوں کے سہارے مقبولیت حاصل کرنے میں زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ جو شخص سوچنے سمجھنے کی معمولی صلاحیت بھی رکھتا تھا اس کے لیے اس بات کو سمجھنا کچھ مشکل نہ تھا کہ ملک بڑی تیزی کے ساتھ تباہی و بربادی کی طرف بڑھ رہا ہے مگر عوامی جذبات کے سیلِ بے پناہ کے سامنے اُن کی کچھ پیش نہ جاتی تھی اور وہ شدید کرب و اضطراب کے ساتھ اس ہونے والے المیہ کو دیکھ رہے تھے۔ بالآخر وہی ہوا جس کا ملک کے بہی خواہوں کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ پاکستان کا ایک حصہ بھارت کے قبضہ میں چلا گیا۔ یہ سانحہ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا بلکہ باشندگانِ ملک کے اندر ایک دوسرے کے خلاف نفرت و حقارت کا جو زہر ایک عرصے سے پھیلایا جا رہا تھا یہ بالکل اس کا فطری نتیجہ تھا۔ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان اسلام کا رشتہ ہی وہ واحد رشتہ تھا جس نے بُعدِ مکانی کے باوجود باشندگانِ ملک کو ایک دوسرے سے قریب کر رکھا تھا۔ حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے جب یہ رشتہ کمزور اور مضمحل ہوا تو علاقائی تعصبات نے سر اٹھانا شروع کیا۔ ان تعصبات کی وجہ سے مغربی اور مشرقی بازو کے درمیان نفرت اور حقارت کے شعلے بلند ہوئے جس نے قومی یک جہتی کو بھسم کر کے رکھ دیا۔ مشرقی پاکستان میں بسنے والوں نے مغربی

پاکستان کے رہنے والوں کو اپنا سب سے بڑا دشمن خیال کیا۔ اور مغربی پاکستان کے باشندوں نے مشرقی پاکستان کے خلاف شدید بیزاری کا اظہار کیا۔ ایک دوسرے کے خلاف اس نفرت و بیزاری کے پیدا کرنے میں عوام کا قطعاً کوئی عمل دخل نہ تھا۔ کیونکہ وہ تو دونوں بازوؤں میں ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے تھے۔ نفرت کی آگ کو برسرِ اقتدار طبقوں کی حماقتوں نے بھڑکایا یا اُن طالع آزما اور موقع پرست سیاسی رہنماؤں نے جو اپنے اثرات کے دائروں کے مطابق ملک کے حصے بخرے کر کے ان میں اپنا الگ الگ تسلط قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ یہی ہوا کہ ایک حصے کی مسندِ اقتدار پر صدر بھٹو صاحب براجمان ہوتے اور دوسرے حصے کے تختِ اقتدار پر شیخ مجیب الرحمٰن نے قبضہ کر لیا۔

ہمارے اس ملک پر آمریت مسلط کرنے کے ماضی میں جو بار بار ناکام تجربات ہوئے تھے ان کی روشنی میں یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ علاوہ اور بہت سے دوسرے اسباب کے پاکستان میں اگر آمریت کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ملک دو الگ جغرافیائی خطوں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل سے زیادہ کا فاصلہ حائل ہے اس لیے آمریت بیک وقت ان دونوں حصوں پر اپنے پنجے یکساں مضبوطی کے ساتھ نہیں گاڑ سکتی اور اگر گاڑ بھی لے تو اس مضبوطی کو برقرار نہیں رکھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ایک سے ایک بڑھ کر آمر نہایت خوفناک عزائم کے ساتھ ملک پر مسلط ہوا۔ مگر تھوڑی مدت کے بعد ہی اس کا سنگھاسن ڈولنے لگا اور عوام اپنے غصب شدہ جمہوری حقوق واپس لینے میں برابر کامیاب ہوتے رہے۔

اب جبکہ پاکستان کے دونوں حصے دو الگ الگ جغرافیائی خطوں کی صورت اختیار کر چکے ہیں جن کے مابین کوئی رشتہ اشتراک باقی نہیں رہا، تو آمریت کے علمبرداروں کے لیے ہر حصے میں فاشزم کا قیام کسی حد تک آسان ہو گیا ہے۔ اس حقیقت کو ہمیں کسی مرحلے پر نظر انداز نہ کرنا چاہیے کیونکہ ملک کے مستقبل کے لیے یہ ایک شدید خطرے کا الارم بھی ہے۔

ہم اس وقت اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ہمارے ملک کے سربراہوں میں آمریت کا رجحان کن وجوہ کی بنا پر پیدا ہوا اور کن حالات نے اس رجحان کو تقویت پہنچائی مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا

(باقی صفحہ ۷ پر)